قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے؟

از جناب مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

(۶)

احسن الحدیث | آپ بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ جس کتاب کے اوصاف وخصائص اور امتیازات وہ ہوں جن کا ذکر سطور بالا میں تفصیل سے ہوچکا ہے تو اُس سے بہتر دوسرا کوئی کلام یا دوسری کوئی بات کیسے ہوسکتی ہے؟

کیونکہ اگر یہ صحیح ہے کہ کسی کلام کی عظمت وجلالت متکلم کی شخصی عظمت وجلال سے وابستہ ہوتی ہے اور ہر ایک ظرف سے وہی چھلکتا ہے جو اس میں موجود ہوتا ہے تو پھر تم ہی فیصلہ کرو کہ کلام الٰہی کا مقام کیا ہونا چاہیے اور جس کتاب اور کلام کی نسبت ذاتِ خداوندی سے ہو اُس کو کس منقبت سے یاد کرنا چاہیے۔

وہ جب دورِ ماضی کے واقعات بیان کرتا اور اُن کے ذریعہ موعظت وعبرت کے درس دیتا ہے، وہ جب اوامر ونواہی سے متعلق خطاب کرتا ہے اور قبول وعدم قبول، وعد ووعید کو سناتا ہے، وہ جب کتبِ سماویہ کی تصدیق اور مہیمن بن کر اُن کے نسخ وتحریف کا اعلان کرتا ہے۔ وہ جب اپنے اعجاز کو پیش کرکے پیروانِ مذاہب وملل کو چیلنج کرتا ہے، وہ جب غوامض وسرائر سے پردہ اٹھا کر حقائق کی روشنی میں ماضی اور مستقبل کے درمیان رشتۂ اتحاد کو واضح اور ظاہر کرتا ہے تو چشم بصیرت افروز اور قلب عبرت آموز ایک لمحہ کے لیے بھی یہ کہنے میں جھجک محسوس نہیں کرسکتے کہ لاریب قرآن "احسن الحدیث اور بہتر بات" ہے اور اس کے امتیازات وخصوصیات کا مقابلہ دنیا کی باتیں، حکمتیں، احکام ومواعظ تو کیا کرسکتیں کتبِ سماویہ

میں سے بھی کوئی کتاب اور کوئی صحیفہ اس کے برابر نہیں رکھا جا سکتا۔

وہ احسن الحدیث ہے اس لیے کہ کوئی بات اپنی ادا اور تعبیر میں اُس کے حُسنِ اعجاز کو نہیں پہونچتی۔ اس لیے کہ کوئی کلام اُس کے غیر متبدل نظم و معانی کے علو اور بلندی کو نہیں پہونچتا اس لیے کہ کوئی کتاب اُس کی موعظت و عبرت آموز نصیحت کے معیار کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اس لیے کہ صحیفۂ غیب و شہود کے فیصلے اُس سے بہتر نہیں اور اُس کی ہمسری کرنے سے عاجز و درماندہ ہیں۔ اس لیے قرآن کا یہ دعویٰ آفتابِ درخشاں کی طرح منور ہے اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ۔

مثانی | قرآنِ عزیز یہ بھی اعلان کرتا ہے کہ میری امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ میں "مثانی" ہوں "مثنیٰ" لغت میں "دو۔ دو" کا مفہوم ادا کرتا ہے گویا کوئی بات اگر مکرر کہی جائے یا کوئی کام اگر دہرایا جائے تو اُس پر "مثنّیٰ" بالتشدید کا اطلاق ہو اکرتا ہے اور قریب قریب اسی مفہوم کو "مثنیٰ" بالتخفیف ادا کرتا ہے اور اعادہ و تکرار کا مطلب لیا جاتا ہے۔ پس قرآنِ عزیز اس لیے مثانی ہے کہ اُس کے اکثر و بیش تر احکام اور مواعظ و قصص، عبرت و نصیحت اور دل نشینی و دل پذیری کی خاطر مکرر اور بار بار دہرائے گئے ہیں اور علم النفس کے ماہرین کو اعتراف ہے کہ پند و نصیحت کے مضامین کو دہرانا اور اُن کا بار بار اعادہ کرنا مقصدِ موعظت و بصیرت کے لیے نہ صرف مستحسن بلکہ ضروری ہے۔

اور اگر یہ معنی لیے جائیں کہ اس کتاب میں خدائے برتر کی ثناء و منقبت کا پہلو تمام کتبِ سماویہ پر فائق و افضل ہے نیز اس کی بلاغت و فصاحت کا اعجاز گویا متکلم کی رفعتِ قدر و جلالتِ شان کی ثنا میں رطب اللسان ہے تو بھی قرآن اس مفہوم کے پیشِ نظر بلاشبہ "مثانی" ہے اور اس صورت میں اس کو "مثنیہ" بمعنی "ثناء" کی جمع تسلیم کرنا ہوگا۔

غرض ادا و تعبیر ہو یا بندش نظم و الفاظ، مفاہیم و مطالب ہوں یا معانی و مقاصد ہر حیثیت سے قرآنِ حکیم "مثانی" ہے اور یہی اس کے اعجازِ کلام کے متعدد دلائل و براہین میں سے

روشن برہان ہے، اس لیے کہ جب وہ کسی واقعۂ ماضی پر عبرت و بصیرت کے لیے روشنی ڈالتا ہے یا جب وہ کسی امر دینی کا اعلان کرتا ہے یا معاش و معاد کے سلسلہ میں کوئی فیصلہ سناتا ہے تو باوجود اس امر کے کہ ایک ہی واقعہ، ایک ہی حکم، ایک ہی مثال اور ایک ہی فیصلہ ہوتا ہے، تاہم وہ اُن کو معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ اس طرح مختلف طریقوں سے بیان کرتا ہے کہ ہر ایک مقام اپنی جگہ مستقل اور ضروری نظر آتا ہے اور کسی ایک جگہ کے متعلق بھی بے محل اور غیر مستحسن ہونے کا تو ذکر ہی کیا ہے غیر ضروری کہنے کی جسارت نہیں کی جا سکتی اور اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جس نہج اور جس اسلوب سے اس کا ایک جگہ ذکر ہوا ہے وہی اس کے لیے موزوں سے موزوں تر تھا اور اُس کی تکرار زیادہ سے زیادہ حلاوت و شیرینی کا باعث ہوتی ہے نہ کہ ملال و دل تنگی کا اور قند مکرر کا اس سے بہتر نمونہ دنیا آج تک پیش نہیں کر سکی پس اگر اس لحاظ سے بھی اس کو "مثانی" کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ دنیا کی کوئی سماوی کتاب کی تلاوت کیجیے الفاظِ کتاب کو ایک سے زیادہ مرتبہ تلاوت کرنے کے بعد اُس کے مسلسل پڑھتے رہنے کا ذوق پیدا نہیں ہوتا اگر ہوتا ہے تو اس کے ساتھ معتقدانہ عشق و محبت کے پیشِ نظر اُس کے مطالب و مفاہیم کے لحاظ سے ہو سکتا ہے لیکن قرآنِ عزیز کا نظم الفاظ اپنے اندر وہ جاذبیت رکھتا ہے کہ ایک ناسمجھ بچہ اور عربی زبان سے ایک ناواقف شخص بھی جب اُس کو تلاوت کرتا ہے تو اُس کے ذوقِ تلاوت کا یہ عالم ہوجاتا ہے کہ بار بار خمار آلود انسان کی طرح پڑھتا اور حظِ وافر حاصل کرتا ہے کیا اچھا کہا ہے کسی حکیم و دانا نے قرآن کے متعلق یہ جملہ کہ "دنیا میں ایسی نثر جس کی ادا، کا شیریں سے شیریں نظم بھی مقابلہ نہ کر سکتی ہو قرآن ہے"۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ	اللہ نے اتاری بہتر بات، کتاب آپس
كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ	میں ملتی، دہرائی ہوئی۔ بال کھڑے ہوتے ہیں
مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ	اُس سے جلد پر اُن لوگوں کے جو ڈرتے
رَبَّهُمْ (زمر)	ہیں اپنے رب سے۔

بعض علماء اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر کہتے ہیں کہ چونکہ قرآنِ عزیز میں سورۂ فاتحہ بھی شامل ہے اور اس کا جزء ہے اور وہ بار بار نماز میں دہراتی جاتی ہے اس لیے قرآن کو بھی "مثانی" کہا جاتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (حجر) — اور ہم نے دی ہیں تجھ کو سات آیتیں وظیفہ اور قرآن بڑے درجہ کا۔

بشیر و نذیر | قرآنِ حکیم جب کہ الہامی کتاب اور کلام الٰہی ہے اور وہ کائنات کی رشد و ہدایت کے لیے نسخۂ کیمیا اور اکسیرِ اعظم ہے تو رشد و ہدایت کا فطری تقاضہ ہے کہ وہ "بشیر" بھی ہو اور "نذیر" بھی۔ کیونکہ کوئی ہدایت، ہدایت نہیں ہو سکتی جب تک وہ احکام الٰہی کے امتثال پر بشارت نہ سناتی ہو اور منہیات کی جانب رغبت پر عذابِ الٰہی سے نہ ڈراتی ہو در اصل مذہب ہی ایسی پونجی ہے جو انسان کا اُس کے خالق و مالک کے ساتھ صحیح ارتباط پیدا کرنا اور آفاقِ حقیقی کا بندوں کے ساتھ حقیقی تعلق قائم رکھتا ہو۔ وہی انسان کو نیک کرداری پر اجر کی بشارت دے کر نیک بناتا اور بد کرداری پر خوف و عذاب کی نذارت سنا کر بدی سے باز رکھتا ہے۔ وہی یہ بتلاتا ہے کہ یہاں ہر عمل کسی نتیجہ کے ساتھ مربوط ہے اور ہر ایک کردار اپنے ثمرہ اور نتیجہ سے منسلک ہے۔ یہاں پاداشِ عمل کے قانون سے غافل ہو جانا ہلاکت اور اس کو پیشِ نظر رکھ کر زندگی کی منزلیں طے کرنا عقل و فطانت ہے۔ اس لیے نیکی اور بدی ایسے شجر ہیں جن کے پھل ایک دوسرے سے متضاد ہی وجود پذیر ہو سکتے ہیں یہ نہیں ہو سکتا کہ نیکی کے شجر پر بدی کا پھل اور بدی کے درخت پر نیکی کے پھول اُگ آئیں۔ اگر آگ کا کام گرمی پہونچانا ہے اور پانی کی ڈیوٹی خنکی کا فائدہ دینا تو بدی کے ذریعہ باغِ جناں کی توقع کرنی اور نیکی کے بیج سے نارِ جہنم کے پودے کا انتظار کرنا اہلِ خرد کا کام نہیں ہے۔

یہی وہ حقائق ہیں جن کے ذکر کا نام بشارت و نذارت ہے اور ان حقائق کے پیش کرنے والے کو "بشیر" و "نذیر" کہتے ہیں چنانچہ یہ خدمت انبیاء و رسل کی زبانِ وحی ترجمان بھی

ادا کرتی رہی ہے اور وہ کتبِ سماویہ بھی جو خدا کی ہدایت و رشد اور دعوتِ حق کے لیے نازل ہوتی ہیں۔

پس قرآن کہتا ہے کہ جس طرح مجھ سے پہلے خدا کی کتابیں بشیر و نذیر بن کر آئی ہیں اسی طرح میں بھی بشیر و نذیر ہوں، فرق صرف اسی قدر ہے کہ مجھ سے قبل کتبِ سماویہ کا نزول خاص خاص ملکوں اور قوموں کے لیے رہا ہے اور میں قانونِ کامل، پیغامِ مکمل بن کر رہتی دنیا تک تمام کائناتِ انسانی کے لیے نازل ہوا ہوں اور میرا یہ امتیاز تمام صفاتِ عالیہ کے اندر جاری و ساری ہے اور میرا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ میں اسود و احمر اور ابیض و اصفر سب ہی کے لیے بشیر و نذیر ہوں۔

میں یہ بھی اعلان کرتا ہوں کہ اعمال اور جزاءِ اعمال کے درمیان گو عقلی اور فطری رشتۂ لازم و ملزوم قائم ہے تاہم یہ رشتہ علت و معلول کا رشتہ نہیں ہے کہ اندھی فطرت اور بے شعور قدرت کے ہاتھوں قائم ہے اور ان کے مرتب و ناظم کے ارادہ و اختیار کو اس بارہ میں قطعاً کوئی دخل نہیں بلکہ مرتب و ناظم کہنا ہی غلط ٹھہرے اس کے برعکس مذہب اور دین کا پیغامِ حق اس شہادتِ کبریٰ کا بھی اعلان کرتا ہے کہ یہاں عمل اور پاداشِ عمل کا معاملہ گو قانونِ قدرت کے زیرِ اثر کارفرما ہے تاہم یہ قانونِ فطرت اور نیچر پر متصرف قانون قدرت اس برتر ہستی کے یدِ قدرت کی گرفت میں ہے جو بے قید قدرت کے ساتھ ساتھ ارادہ و اختیار بے چون و بے چگون کی بھی مالک ہے اس لیے اس درگاہ میں درِ توبہ بھی وا ہے اور ہر لمحہ یہ بشارت ٹوٹے ہوئے دلوں اور گناہ پر شرمندہ عاصیوں کے لیے مرہم کا کام دیتی ہے۔

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے
عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا	اے میرے وہ بندو جو (گناہ کرکے)
مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ	اپنے نفسوں پر حد سے گذر گئے ہیں
يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا	خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔

إِنَّهُ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ بلاشبہ اللہ تمام گناہوں کو بخش دیتا ہے
(زمر) بلاشبہ وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے

اور نکوکار انسانوں کو ڈراتا ہوں کہ کہ کہیں نکوکاری پر نازاں اور مغرور نہ ہو جانا کہ ساری نیکی برباد ہو کر شعلۂ نار کا ذخیرہ نہ بن جائے۔

هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ وہ تم کو خوب جانتا ہے جب اُس نے
مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ تم کو زمین سے پیدا کیا اور جب تم
فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ فَلَا تُزَكُّوْا اپنی ماؤں کے پیٹوں میں چھپے تھے
اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ تو اپنے آپ کو پاک نہ کہو، وہ خوب
بِمَنِ اتَّقٰى ۝ ۳۲/۲۵ جانتا ہے جو متقی ہے۔

اور ان دونوں باتوں کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی واضح کرتا ہوں کہ ثواب وعقاب کا یہ تعلق چونکہ نیک وبد اعمال کے ساتھ وابستہ ہے اس لیے یہ تعلق قانونِ فطرت کے پیشِ نظر صحیح اور درست ہے لیکن یہ بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اعمال کا یہ تعلق اپنے ثمرات کے ساتھ حقیقی نہیں بلکہ صاحبِ ارادہ و اختیار ہستی کے قائم کر دینے پر ہے کہ اُس نے یوں ہی فیصلہ کیا ہے اور اس طرح قانون بنا دیا ہے لہٰذا جنت وجہنم اور ثواب وعقاب کا حقیقی تعلق اُس کے اپنے فضل وکرم سے وابستہ ہے اور جنت وجہنم اُس کی رضاء وعدم رضاء کا ثمرہ وعلامت ہے معلول نہیں۔ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ بس یہی وہ حقیقت ہے قرآن عزیز جس کا اس طرح اظہار کرتا ہے

كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ایک کتاب ہے کہ جدا جدا کی گئی
قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ہیں اُس کی آیات قرآن ہے عربی
بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا زبان کا سمجھ والوں کے لیے خوشخبری
سنانے والا اور ڈرانے والا۔

مبارک | اب آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ جو کتاب ہدایت و سعادت کا پیام، فلاح و نجاح کی رہنما معاش و معاد کی رہبر، پند و موعظت کا ذخیرہ، حکمت و حکم کا مخزن، قصص و امثال کا معدن، خطابتِ حق کا مبلغ، دعوتِ الی الحق کا منادی، نیکی و بدی کی بشیر و نذیر ہو اُس سے زیادہ اور بہتر کون سی کتاب ہو سکتی ہے اور جب سرمدی اور ابدی نجات کا سوال درمیان میں آجائے تو قرآن کے ماسوا کس کو پیش کیا جا سکتا ہے پھر ایسی کتاب ہی اگر "مبارک" نہ کہلائے تو پھر اس موقر لقب اور معزز خطاب کا استحقاق کس کو پہونچ سکتا ہے؟ بلاشبہ قرآنِ حکیم مبارک کتاب ہے اور جب کہ اُس کی نازل کرنے والی مقدس ہستی خود صاحبِ برکت و سعادت ہو "تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ" اور جس کا نزول مبارک رات میں ہوا ہو "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُبَارَكَةٍ" تو پھر وہ کلام کیوں "مبارک" نہ ہو۔

هٰذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ (انعام)	یہ کتاب ہے ہم نے اُس کو اُتارا ہے مبارک پس تم اس کی پیروی کرو

منادی | ندا، پکار، صدا، اُس آواز کا نام ہے جو غافلوں کو ہشیار، خوابیدہ کو بیدار، اور بے پرواہ انسانوں کو خبردار، کرنے کے لیے دی جاتی ہے۔ قرآن بھی اس مفہوم کے پیشِ نظر پکارنے والے کی پکار، صدائے خوش آہنگ اور ندائے راز خواب گراں خیز ہے وہ صوتِ ہادی ہے اور برقِ باطل سوز، وہ رعدِ حق ہے اور صدائے دل آویز، اس صدا نے دکھی دلوں کو تسکین دی، بہروں کو شنوا، اندھوں کو سوجاکھا اور گونگوں کو گویا بنا دیا۔

یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی آواز بے شک صحرا میں ایک پکارنے والے کی پکار تھی مگر بنی اسرائیل کی بھٹکتی ہوئی بھیڑوں کے لیے، یسوع مسیح کی صدا یقیناً صدائے حق تھی مگر فریسیوں، صدوقیوں، اور اسرائیلیوں کے لیے۔ ندائے موسیٰ بلاشبہ صوتِ ہادی تھی لیکن فرعونیوں اور یہودیوں کے لیے لیکن قرآن کی ایک ہی رعد آسا اور برق مثال صدا نے

سارے عالم کو جگا دیا اور تمام کائنات میں اپنی صوتِ ہادی سے تہلکہ ڈال دیا اور ہر سمت اور ہر گوشہ میں اقدارِ عالم کو زیر و زبر کر دیا۔

نہیں وہ ڈھول کی آواز نہیں ہے کہ تہی دامن ہو اور نہ وہ رعد کی کڑک ہے کہ شنوا کو بہرہ بنا دے اور نہ وہ برقِ چشمک زن ہے کہ بصارت و بصیرت کو بے نور کر دے اور نہ وہ صحرا میں پکارنے والے کی صدا ہے کہ بے اثر ہو کر رہ جائے بلکہ وہ ندائے حق ہے، صوتِ ہدیٰ ہے، صدائے خدا ہے، اس لیے حق کی سربلندی، ہدایت کی سربراہی اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی آبیاری اُس کا ثمرہ اور نتیجہ ہیں۔

کامرانی اُس کے دامن کو چومتی اور کامگاری اُس کے قدموں پر نثار ہوتی ہے اور "اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" کا اعلان کر کے اپنے فداکاروں کے لیے معراجِ فلاح و نجاح کا تمغہ بخشتی اور تاجِ علو عطا کرتی ہے۔

یہ جو کچھ کہا گیا اور کہا جا رہا ہے لفظی صف آرائی اور تعبیری زیب و زینت و زیبائی نہیں ہے بلکہ ناقص اور درماندہ الفاظ و عبارت میں اصل حقیقت کا اظہار ہے۔ یہ مبالغہ تو کجا حقیقتِ ثابتہ کے رخِ روشن کی صحیح تصویر بھی نہیں حقیقت تو بلاشبہ اس سے بھی بلند و ارفع ہے۔

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا	اے پروردگار! بلاشبہ ہم نے پکارنے
يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا	والے کی پکار کو سنا جو ایمان کے لیے
بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا	ہے۔ وہ یہ کہ اپنے پروردگار پر
(آل عمران)	ایمان لاؤ۔ پس ہم ایمان
	لے آئے۔

یہ صحیح ہے کہ "منادی" سے ذاتِ قدسی صفات (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی مراد ہے مگر اس کے باوجود قرآن کو "منادی" کہنا اشکال کا موجب نہیں ہے اس لیے کہ منادی کی

ندائے حق جب کہ "ایمان برب العٰلمین" ہے تو اس ندا کا مصداق جس طرح پیغمبرِ خدا کی شخصیت ہوسکتی ہے اُن طرح وہ کتاب بھی اس کا مصداق بن سکتی ہے جس کو کلامِ الٰہی کہہ کر پیغمبرِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) امت کے سامنے پیش کرتے ہیں اور جو اپنے اعجازِ بلاغت و فصاحت اور معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ راہِ ہدایت و سعادت کی جانب پکار پکار کر ہم گم کردگانِ راہ کو راہِ مستقیم سے روشناس کراتی ہے۔

علم پھر اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ دنیا کے تمام کاروبار اور ہر قسم کے معاملات و امور کا مدار دو حقیقتوں پر ہوتا ہے ایک علم اور دوسری عمل۔ اس لیے کہ اگر علم حاصل ہے مگر عمل مفقود تو وہ "علم" تعطل اور بے کاری کی نذر ہو جائے گا اور اگر عمل موجود ہے مگر "علم" سے محرومی ہے تو وہ عمل کہیں مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتا بلکہ موجبِ نقصان و خسران بن جائے گا تو یوں کہیے کہ دنیا کے امور کی گاڑی کے یہ دو پہیے ہیں کہ دونوں میں سے کوئی ایک بھی موجود نہ ہوگا تو گاڑی کا چلنا معلوم؟ پس اسی طرح دینی امور اور روحانی معاملات بھی انہی دو حقیقتوں کے اشتراک سے وابستہ ہیں اور ان دونوں کی صحت و سقم پر روحانی اور دینی امور کے صحت و سقم کا دار و مدار ہے۔

تو اب یہ دعویٰ بے دلیل نہ ہوگا کہ روحانی سعادت اور سرمدی فلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے کائناتِ انسانی کے لیے مسطورہ بالا دونوں حقیقتوں کا خلاصہ اور عطر عطا کر دیا ہے اور ان ہی ہر دو حقیقتوں کا نام مذہب کی اصطلاح میں قرآن اور اسوۂ حسنہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ قرآن علم ہے اور اسوۂ حسنہ عمل اور ان ہی کا مجموعہ سعادتِ ابدی اور فلاحِ سرمدی کے لیے کفیل ہے۔

اس حقیقت کا بیان ان الفاظ میں بھی کیا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے تمام انبیاء و رسل (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کو تصدیقِ نبوت و رسالت کے سلسلہ میں جو بھی معجزات عطا ہوئے وہ سب کے سب عملی تھے۔ مثلاً ید بیضا، عصاء موسیٰ

دم عیسیٰ، ناقۂ صالح (علیہم السلام) اور اسی طرح کے دوسرے معجزات عملی معجزات تھے اور اس بنا پر اُن انبیاء علیہم السلام کے بعد یا اُن کی زندگی ہی میں اپنا مقصد پورا کر کے ختم ہو گئے اور اگرچہ نبی اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بہت سے عملی معجزات دیے گئے مگر ان سب کے برعکس آپؐ کو قرآن ایسا معجزہ عطا ہوا جو علمی ہے اور اسی وجہ سے وہ ابدی و سرمدی پیغام ہے جس کے ختم اور فنا ہو جانے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔

غرض وہ خدائے برتر کا معجز کلام کائناتِ جن و انس کی فلاح دارین کا مکمل نظام علوم و معارف کا گنجینہ، اتقان و اذعان کا خزینہ، حیاتِ سرمدی کا سرچشمہ اور نجاتِ ابدی کا ضامن ہے اور یہ صرف اس لیے کہ وہ "علم" ہے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ	اور اگر تم نے اُن کی خواہشوں
مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ	کی پیروی کی بعد اس کے کہ تم کو
الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ	پہنچ چکا "علم" تو بے شک تم بھی
الظّٰلِمِيْنَ ۝ (بقرہ)	بے انصافوں میں ہو گئے۔
فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ	پھر جو جھگڑا کرتے ہیں تم سے اس
بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ	قصہ میں بعد اس کے کہ آ پہونچا تمہارے
(آل عمران)	پاس "علم" (سچی خبر)
وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا	اور اسی طرح ہم نے اتارا یہ کلام
عَرَبِيًّا وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ	حکم عربی زبان اور اگر تم ان کی خواہش
بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ	کے مطابق چلے بعد اس کے کہ تم
مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ	کو "علم" پہونچ چکا تو کوئی نہیں تیرا
لَا وَاقٍ ۝ (رعد)	حمایتی اور بچانے والا اللہ سے۔

عدل | لیکن کسی کتاب یا دستور کو اگر صرف یہی شرف حاصل ہو کہ وہ "علم" ہے تو مقصدِ رشد

وہدایت کے لیے یہ کافی نہیں ہے اور تشنۂ آبِ بقا کی سیرابی اور تسکین کا باعث نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ یہ بھی ثابت نہ ہو جائے کہ وہ "عدل" پر مبنی ہے اور جو علم و یقین اور اذعان و ایقان اُس نے ہم کو عطا کیا ہے اُس کا ہر ایک فیصلہ، اُس کی ہر ایک ترغیب و ترہیب اُس کی ہر ایک تعلیم افراط و تفریط دونوں سے جدا سر تا سر "عدل" ہے۔

علماءِ لغت جب ظلم و عدل کے معنی بیان کرتے ہیں تو "وضع الشئی فی غیر محلہ۔ کسی شے کو اُس کے حقیقی مقام پر نہ رکھنا" کو ظلم سے تعبیر کرتے ہیں اور "وضع الشئی فی محلہ۔ ہر شے کو اُس کے حقیقی مقام پر جگہ دینا" عدل کہلاتا ہے۔ تو ایسی صورت میں اگر قرآن یہ نہ بھی کہتا کہ وہ "عدل" ہے تب بھی اس لیے عدل ہوتا کہ وہ خدائے حکیم و خبیر کا کلام ہے جو ظلم کے ہر ایک شائبہ سے وراء الوراء اور پاک ہے لیکن قرآن نے صرف اس عقلی استدلال ہی کو کافی نہیں سمجھا بلکہ اس سے آگے صاف اور صریح الفاظ میں یہ کہہ دینا ضروری سمجھا کہ قرآن کلامِ الٰہی ہے، اور بلاشبہ وہ "عدل" بھی ہے۔

اور یہ تو بارہا کہا جا چکا ہے کہ ان جیسے مقامات پر قرآن اسم فاعل کے صیغے استعمال نہیں کرتا بلکہ صفت کے صیغہ کو ترجیح دیتا ہے اس لیے کہ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ یہ وصف اُس کے اندر بدرجۂ تمام و کمال موجود ہے اور اس طرح موجود ہے کہ گویا موصوف اور صفت کے درمیان دوئی کا رشتہ بھی باقی نہیں رہا۔ اور اس مقام پر تو خصوصیت کے ساتھ اس لیے بھی اُس نے "عادل" کی جگہ "عدل" کے ساتھ تعبیر کیا کہ یہ حقیقت آشکار ہو جائے کہ قرآن اگر صرف عادل ہوتا اور عدل نہ ہوتا تو یہ کہنے کی گنجائش رہتی کہ کسی عادل اور منصف کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی بھی حالت اور کسی بھی وقت میں عدل کے خلاف نہیں کر سکتا یا نہیں کہہ سکتا کیونکہ بہت سے عادل گاہے نادانستہ ہی عدل کے خلاف کہہ گذرتے یا کر گذرتے ہیں۔ تاہم چونکہ اُن کے اندر یہ وصف اکثر و بیش تر موجود پایا جاتا ہے اس لیے اُس کو عادل ہونے سے خارج نہیں کیا جاتا۔

مگر قرآنِ حکیم چونکہ وہ عادل نہیں ہے کہ جس کا وصفِ عدل کبھی دانستہ یا نادانستہ اُس سے جدا ہو جاتا ہو بلکہ اُس کا ہر ایک فقرہ اور ہر ایک جملہ عدل ہی عدل ہے تو اس لیے ضروری ہوا کہ اُس کو "عادل" نہ کہا جائے بلکہ "عدل" کہا جائے تاکہ ہر ایک شخص بآسانی یہ سمجھ جائے کہ قرآن کے دائرہ میں عدل، قرآن ہے اور قرآن، عدل ہے گویا لازم و ملزوم میں انفکاک و جدائی ممکن ہے لیکن قرآن اور عدل کے درمیان مفارقت محال اور ناممکن ہے اسی لیے قرآنِ عزیز نے بڑی اہمیت مگر معجزانہ اختصار کے ساتھ اس حقیقت کو اس طرح ادا کیا ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ — اور تمہارے پروردگار کی بات
صِدْقًا وَّعَدْلًا (الانعام) — پوری سچی ہے اور انصاف کی

غرض جو بات یا جو حقیقت نقص و خام کاری سے پاک، افراط و تفریط سے بالاتر، بے محل و بے موقع ہونے سے بلند و بالا اور ہر حیثیت سے اعتدال و انصاف گیر ہو اُس کا نام "عدل" ہے اور یہی ہے وہ عدل جس کو اس آیت میں قرآنِ حکیم کی صفت ظاہر کیا گیا ہے اور یہی صفت اس کی دلیل ہے کہ قرآن ابدی پیغام اور سرمدی قانون ہے کیونکہ بقاء اصلح کے قانون کا تقاضا ہے کہ جب کوئی شے اپنی جگہ چھوڑ دے اور بے محل ہو جائے تو گویا اُس نے جگہ نہیں چھوڑی اور بے محل نہیں ہوئی بلکہ اُس نے اپنے فناء کے پیغام پر دستخط کر دیے اور وہی شے بقاء دوام کا مقام حاصل کر سکتی ہے جو ہر حیثیت سے با محل، کامل، تام، صادق، اور عادل ہو۔ اور جس میں یہ تمام صفات یک جا جمع ہوں تو وہ صادق و عادل ہی نہیں ہے بلکہ "صدق" و "عدل" ہے اور بقاء دوام اور حیاتِ مدام کی ہمدم و رفیق۔

(باقی آئندہ)

حضرت شاہ فخر الدین دہلویؒ

از

جناب پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی۔ ایم، اے

محمد شاہ کی دلی ہے۔ زوال و انحطاط کے آثار ہر طرف نمایاں ہیں۔ قتل و غارت گری کا دور دورہ ہے۔ سکھ اور مرہٹے ہر طرف لوٹ مار کرتے پھر رہے ہیں۔ نادر شاہ کا قتلِ عام اسی سرزمین پر ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ہچکیاں لے رہا ہے اور دم توڑنا ہی چاہتا ہے جس دور کی ابتدا ایبک و التمش کی رزم آرائیوں سے ہوئی تھی وہ آج محمد شاہ کی بزم آرائیوں اور ہنگامہ ہائے نا و نوش میں ختم ہو رہا ہے۔ فلسفہ تاریخ کے مفکر کی یہ صدا فضاؤں میں گونج رہی ہے۔

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر (اقبال)

اس سیاسی بد امنی اور اخلاقی پستی کے زمانہ میں اللہ کے کچھ بندے درس و تدریس کے کام میں مشغول ہیں، ہوا تیز و تند ہے لیکن وہ اپنا چراغ جلا رہے ہیں طوفان امنڈتا چلا آ رہا ہے لیکن وہ ہمت نہیں ہارتے اور اپنے کام میں اسی طرح مشغول ہیں۔ دہلی میں جس کا عالم بقول حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے یہ تھا۔

بِهَا مَدَارِسُ لَوْ طَافَ لَبَصِيْرُ بِهَا لَمْ تَقَعْ عَيْنُهُ اِلَّا عَلَى الصُّحُفِ

جس طرف نکل جائیے، اس میں مدارس نظر آئیں گے اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہوگا۔ (شاہ عبد العزیزؒ)